JOURNAL OF RESEARCH (URDU)

ISSN (Print): 1726-9067, ISSN (Online):1816-3424
Volume No. 42, Issue No.01

TITLE OF THE PAPER

پاکستانی فکشن میں متبادل بیانیہ (عبداللہ حسین کے ناولوں کا خصوصی مطالعہ)

AUTHOR(S)

* **Dr. Khalid Munir Chaudhry**
Campus Director, Institute of Technology & Art
Virtual University, Vehari Campus, Vehari

CONTACT

* khalid.munir.ch@gmail.com

HISTORY OF THE PAPER

Received on:	March 24, 2026
Accepted on:	June 26, 2026
Published on:	June 30, 2026

DETAIL(S)

Volume No. 42, Issue No. 01, Page No: 23-34
Publisher:
Department of Urdu, Bahauddin Zakariya University
Multan (Pakistan)-60800

LICENSE

This work is licensed under a Creative Commons Attribution 4.0 International License

COPYRIGHT

©The author(s) 2026. ©Journal of Research (Urdu) 2026.
This publication is an open access article.

JOURNAL'S PROFILE

Journal of Research (Urdu) is a bi-annual "Y" category journal approved by Higher Education Commission of Pakistan.
It started in 2001 from Bahauddin Zakariya University, Multan (Pakistan). At that time, it was owned by the Faculty of Languages & Islamic Studies. Later in 2008, Higher Education Commission of Pakistan recognized it as a research journal of Urdu in Category "Z". Since then, it is owned by the Department of Urdu, BZU, Multan. In 2014, it was upgraded and accepted for Category "Y".

CONTACT

Dr. Muhammad Asif
Editor, Journal of Research
Department of Urdu, BZU Multan-60800

MOBILE:
+92 333 6062921

WEBSITE:
https://jorurdu.bzu.edu.pk/website/

EMAIL:
jorurdu@bzu.edu.pk
muhammadasif12@bzu.edu.pk

ADDRESS

Office of the Journal of Research (Urdu), Department of Urdu, Bahauddin Zakariya University, Multan

Journal of Research (Urdu)
ISSN (P): 1726-9067, ISSN (E):1816-3424
Volume No. 42, Issue No. 1, June 2026

* ڈاکٹر خالد منیر چودھری

پاکستانی فکشن میں متبادل بیانیہ
(عبداللہ حسین کے ناولوں کا خصوصی مطالعہ)

Pakistani Urdu Fiction as Counter Narrative
(Special Study of Abdullah Hussain's Novels)

ABSTRACT

Pakistani Fiction most of the times presented counter narrative against different powerful narratives and narratives of the powerful segments of the society and some times of state. This article mainly focuses on how Pakistani Novel destabilizes hegemony of ideological narratives and presented a parallel or counter narrative against power centers. The paper is based on the work of Abdullah Hussain.

KEYWORDS

Abdullah Hussain, Power Discourse, Anti Local Narrative, Counter Narrative, Colonialism, Imperialism, Novels, Criticism

ناول کسی سماج کے فکری، سماجی، سیاسی اور ثقافتی نظام کا حقیقی عکس پیش کرنے کی بھرپور صلاحیت رکھتا ہے یہی وجہ ہے کہ پاکستانی ناول میں اس خطے کی کئی ہزار سالہ ثقافتی تاریخ اور برصغیر کے سماج کی تہذیبی قدروں کی بازیافت کی کوشش نظر آتی ہے۔ برصغیر کی تقسیم (1947ء) سے قبل کی دہائی میں ناول میں مختلف تجربات کے نتیجے میں سامنے آنے والا رجحان جدیدیت کا تھا۔ اس سے پہلے ترقی پسند تحریک سے وابستہ ادیب سماجی صورت حال کو ادب میں پیش کرنے کا کامیاب تجربہ کر چکے تھے۔ تقسیم ہند کے بعد کی صورت حال سرحد کے دونوں جانب مایوسی، تشکیک، شناخت کے بحران سے عبارت تھی۔ تقسیم کے نتیجے میں لوگوں کی زندگیوں کا حصہ بننے والا کرب ناول کے

موضوعات میں نمایاں جگہ پاچکا تھا۔ ہمارے معاشرے میں فکر تونسوی کا ''چھٹا دریا''، شوکت صدیقی کا ''خدا کی بستی'' اور ''جانگلوس''، قراۃالعین حیدر کا ''آگ کا دریا''، عبداللہ حسین کا ''اداس نسلیں'' اور ''نادار لوگ''، خدیجہ مستور کا ''آنگن'' اور ''زمین'' ایسے ناول ہیں جن میں تقسیم سے فوراً بعد سے اگلی چند دہائیوں کے دوران کی عصری زندگی کے مسائل سامنے لائے گئے ہیں۔ ان ناولوں سے ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے مصنفین نے شعوری یا لاشعوری طور پر رائج بیانیے کے متوازی خیالات پیش کیے ہیں جس کی بنا پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ پاکستانی فکشن متبادل بیانیہ پیش کرتا ہے۔ ڈاکٹر خالد اشرف کے خیال میں پچھلی صدی کی آٹھویں دہائی تک کے ان ناولوں سے جو تصویر ابھرتی ہے وہ یہ ہے کہ یہاں کے فرد کے لیئے دینی، نفسیاتی و جذباتی طور پر آزادانہ زندگی بسر کرنے اور فطری طور پر نشوونما حاصل کرنے کے مواقع محدود ہیں اور مذہب و کلچر کے نام پر ایک ایسا پر تشدد معاشرہ وجود میں آچکا ہے جہاں عام ڈگر سے ہٹ کر سوچ رکھنے والے شہریوں اور اقلیتی گروپوں کے ساتھ ناروا داری کا سلوک کیا جاتا ہے۔ پچھلی صدی کی آخری دہائی تک آتے آتے ہمارا معاشرہ ایک ایسی محبوس سوسائٹی بن چکا ہے جہاں لبرل ازم اور جدید طرز فکر کی روشنی کم پہنچ پائی ہے۔''(1)

پاکستانی فکشن لکھنے والوں میں تقسیم کے بعد سے ہی سرکاری، اور سیاسی بیانیے کے متوازی بیانیے کی پیشکش کا شعوری یا لاشعوری رجحان نظر آنا شروع ہو جاتا ہے اور اس میں عبداللہ حسین کا نام نمایاں ہے۔ عبداللہ حسین کے ''اداس نسلیں (1963ء)'' کے بارے میں مختلف آرا سامنے آتی رہی ہیں جن میں یہ کہا جاتا رہا ہے کہ یہ ناول ''آگ کا دریا'' سے متاثر ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی کہ اس ناول کے حوالے سے عبداللہ حسین کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ وہ اشرافیہ کے اخلاقی کھوکھلے پن کو خوب بے نقاب کرتے ہیں''(2)

یہ ناول انگریز دور کے متحدہ ہندوستان میں بسنے والے ایک کسان کے بیٹے نعیم کی کہانی ہے جس میں انگریز حکومت کے جبر تلے پسے ہوئے کسانوں اور جنگ کے لیئے زبردستی بھرتی کیے جانے والوں کا المیہ اس کا ایک رخ ہے۔ دوسری طرف یہ برصغیر کے بسنے والوں کی وہ تاریخ ہے جس کا زمانی عرصہ 1857ء سے شروع ہو کر 1947ء تک کا ہے۔ برصغیر کا کسان اور محنت کش انگریز کے جبر و استبداد سے سب سے زیادہ متاثر ہو رہا تھا۔ روشن آغا کے خاندان کی شاہانہ زندگی کو قائم رکھنے کے لیئے مالیانہ، آبیانہ اور موٹرانہ بھی یہی کسان اور محنت کش ادا کرتے تھے اور ایک لاحاصل جنگ میں حصہ لینے کے لیئے جبری بھرتی کے بعد اپنی جانیں بھی اسی طبقے کے لیئے وار دیتے تھے۔ ان کے

فوج میں زبردستی بھرتی کے عمل کے نتیجے میں روشن آغا اور اس جیسے اوروں کو خطاب اور جاگیریں عطا ہوتی تھی۔اور ان کی زندگی کو سہل بناتے ہوئے یہ محنت کش خود موت کو گلے لگاتے تھے۔ان کسانوں اور محنت کشوں کا کسی سیاسی پارٹی کے ساتھ کوئی تعلق نہیں تھا۔ یہ سیدھے سادھے لوگ جنہیں ہم حاشیے پر موجود تصور کر سکتے ہیں آزادی کی جنگ میں بھی کام آئے اور سب سے زیادہ نقصان انہیں لوگوں کا ہوا۔عبداللہ حسین نے کہانی کے پہلے حصے میں انہیں کسانوں کی زندگی کا عکس پیش کیا ہے۔ یہاں یہ بات عرض کرنے میں مجھے کوئی باک نہیں کہ اس ناول پر زیادہ تر گفتگو اس کے تاریخی پہلو کے حوالے سے ہوئی ہے۔ جبکہ اس ناول میں عبداللہ حسین نے برصغیر کے مزدور، کسان اور محنت کش طبقے کے المیوں کو نوآبادکار کے جبر کے نتیجے کے طور پر پیش کیا ہے۔ عقیل احمد صدیقی اس بارے میں کہتے ہیں کہ

> ''عبداللہ حسین نے اداس نسلیں میں لاشعوری طور پر ہی سہی نوآبادیانے کے تاریخی عمل کو بالواسطہ طور پر فرد کے المیے کا ذمہ دار قرار دیا ہے۔ یہ ناول نعیم کے کردار کی وساطت سے وقت اور تاریخ کے انتشار اور اس کے نتیجے میں فرد کی ہر آن بکھرتی، منقسم ہوتی شخصیت کو اس طرح موضوع بناتا ہے کہ یہ ناول بیک وقت مزاحمتی ادب بھی ہے اور مظلوم کا ادب بھی۔''(3)

روشن آغا کو ملنے والی جاگیر کرنل جانسن کی زندگی بچانے کے انعام کے طور پر انگریز سرکار سے ملی 1857ء میں باغیوں کے ہاتھوں زخمی ہونے والے کرنل جانسن جو برطانیہ کے شاہی خاندان سے تعلق رکھتا تھا کو اپنے گھر میں پناہ دینے اور ان کی مرہم پٹی کر کے ان کی جان بچانے کے صلے میں بے پناہ مراعات ملیں۔اس طرح حاصل ہونے والی مراعات کے نتیجے میں انگریز سرکار سے وفاداری اس طبقہ اشرافیہ کے لیئے ان مراعات کے حصول اور ان سے مستقل فیض پانے کی خواہش کی وجہ سے مجبوری بن جاتی تھی اور وہ انگریز سرکار کی خوشنودی کے لیے ہر کام کرنے کو تیار تھے۔ جس میں جنگ کے لیے جبری بھرتی اور لگان، مالیانہ، آبیانہ وغیرہ کی وصولی شامل تھی۔ روشن آغا کو جاگیر ملنے کے حوالے سے عبداللہ حسین لکھتے ہیں۔

> ''زمین گھیرنے کی دو روایتیں تھیں۔ایک کے مطابق نواب صاحب نے گھوڑے پر سوار ہو کر چکر لگایا اور گھوڑے کی پونچھ کے ساتھ ایک شہد بھرا ٹین باندھ دیا جس کے پیندے میں سوراخ تھا۔ شہد ٹپکتا رہا اور کیڑے مکوڑے آکر اس پر جمع ہو گئے۔ اس طرح قدرتی حد بندی زمین کی ہو گئی۔ دوسری کے مطابق انہوں نے پیدل بھاگنا شروع کیا اور بانس کی کھپچیاں راستے میں گاڑتے گئے۔ غروب آفتاب کے وقت جب واپس پہنچے تو سانس اکھڑ گئی پلٹ کر گرے اور

مرتے مرتے بچے۔"(4)

مسلمانوں کی حکومت کے خاتمے کے بعد مغلوں کی حالت کا ایک استعارہ اس ناول کے کردار نعیم اور اس کے خاندان کی شکل میں موجود ہے اور ان کے نام یہ ظاہر کر رہے ہیں کہ یہ کس خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ ایک وقت میں ہندوستان پر حکومت کرنے والے اب محض ایک چھوٹے سے گاؤں میں کاشتکار ہیں۔ نعیم بیگ، نیاز بیگ کا بیٹا اور ایاز بیگ کا بھتیجا ہے جو مرزا محمد بیگ کے بیٹے تھے جو روشن آغا کا دوست تھا اور روشن آغا اسے اپنے ساتھ روشن پیلس لے آئے تھے۔ روشن محل طبقہ اشرافیہ کی نمائندگی کر رہا ہے جبکہ روشن پور اس طبقے کی نمائندگی کرتا ہے جو مجبور و بے کس ہے اور استحصال کا شکار ہے ان کے استحصال میں انگریز سرکار کی معاونت یہاں کا طبقہ اشرافیہ کر رہا ہے۔ نعیم روشن محل اور روشن پور جو کہ دو الگ الگ شناختیں ہیں کے درمیان نفسیاتی طور پر کشمکش کا شکار رہتا ہے۔ عبداللہ حسین نے ان دونوں طرح کی صورت حال کو شعوری طور پر اس ناول میں ظاہر کیا ہے۔ ذیل کا اقتباس دیکھیے۔

> "اس کے مٹکے اناج سے بھرے ہیں اور اس نے موڑا نہ دیا۔ روشن آغا کے سامنے پیش کیا جائے۔" منشی نے کہا۔ "احمد دین سحر زدہ سا آہستہ آہستہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا اس کی نئی ابرق لگی سفید پگڑی کا شملہ سیدھا کھڑا تھا اور اس نے لمبے لڑوں والا ریشمی تہمد باندھ رکھا تھا۔ اس کے تیل سے چپڑے ہوئے چہرے کی سیاہ جلد چمک رہی تھی۔ "بیل کی طرح.... بیل کی طرح...." منشی نے کڑک کر کہا اور نوجوان لڑکوں کی طرف دیکھا۔ لڑکوں نے اٹھ کر اس کی بغلوں میں ہاتھ دیے اور گھٹنوں کے بل گرا دیا۔ ایک لفظ منہ سے نکالے بغیر وہ چاروں ہاتھ پاؤں پر ہو گیا۔ منشی نے جھٹک کر اس کی پگڑی اتاری اور لڑکے کے ہاتھ میں دے دی۔ "بیل کو رسی ڈالو...." اس نے کہا۔ لڑکے نے پگڑی کا ایک سرا اس کے گلے میں باندھا دوسرا ہاتھ میں پکڑ لیا۔ "اس کے منہ میں چارہ دو۔" منشی نے کہا۔ ایک لڑکا خشک گھاس لا کر اس کے منہ میں ٹھونسنے لگا۔ احمد دین نے دونوں ہاتھ ہوا میں پھیلائے اور پھٹی ہوئی آواز میں چلایا۔ "نہیں۔ نہیں۔ نہیں۔" اس کی باچھوں سے گھاس کے تنکے لٹک رہے تھے۔ لڑکوں نے گھاس ٹھونس کر اس کا منہ مضبوطی سے بند کر دیا۔ "چلو" منشی رسی کھینچتے ہوئے بولا۔ بوڑھا کسان چوپایوں کی طرح زمین پر چلنے لگا۔ انتہائی ذلت کے احساس سے اس کا چہرہ بد نما ہو گیا۔"(5)

مجبور و بے بس کسانوں کے ساتھ طبقہ اشرافیہ کا یہ سلوک آج بھی جاری ہے۔ اپنے ذاتی مفادات کے لیئے

ان عام انسانوں کو استعمال کرنا اشرافیہ کے لیے ایک معمولی بات ہے۔ روشن پور میں بھی جب جبری جنگی بھرتی کے لیئے نوجوانوں کو لے جایا جاتا تو ان کو سنگین لگی رائفلوں سے جانوروں کی طرح ہانکا جاتا۔ ان کی پسلیوں میں رائفلوں کے دستے اور سنگینیں چبھو چبھو کر ان کو ان کے بیلوں سے علیحدہ کیا جاتا کیونکہ وہ بالکل بچوں کی طرح اپنے پیارے بیلوں کے سینگوں سے لپٹ جاتے۔ اور ان کے خوف کی وجہ سے دبی دبی زبان سے ان کو گالیاں بھی دیتے رہتے۔ مہندر سنگھ اور نعیم کا مکالمہ اس صورتحال پر روشنی ڈال رہا ہے اور عبداللہ حسین نے کمال مہارت سے یہ حصہ تحریر کیا ہے اب اس مکالمے میں ایک فریق مہندر سنگھ سکھ مذہب سے تعلق رکھتا ہے اور اس کی مذہبی اور ثقافتی شناخت دوسرے فریق نعیم سے مختلف ہے جو مسلمان ہے لیکن ان دونوں کو یہ احساس ضرور ہے کہ انگریز کے جبر واستبداد میں کون لوگ ہماری اس حالت کے ذمہ دار ہیں۔ مہندر سنگھ کے پوچھنے پر نعیم بتاتا ہے کہ جرمنوں نے حملہ کیا ہے ہم اس لیے لڑ رہے ہیں۔ مہندر سنگھ کہتا ہے کہاں کیا روشن پور پر؟ اور جب نعیم اسے کہتا ہے کہ روشن آغا ہمارے مالک ہیں اور انگریز روشن آغا کے مالک تو مہندر سنگھ چڑ جاتا ہے اور کہتا ہے کہ کل کتنے مالک ہیں ایک ہی دفعہ بتاؤ۔ یہ مکالمہ برصغیر کے عام عوام کی ذہنی کیفیت کی عکاسی کرتا ہے اور ان کی سوچ میں کلبلاتے ہوئے سوالات سامنے رکھتا ہے جس کے درست جواب اگر دستیاب ہوں تو وہ متبادل بیانیہ ہوں گے جس کی طرف توجہ دلانی مقصود ہے۔

اسی طرح جلیانوالہ باغ کی کہانی سنانے والے مچھلی فروش بوڑھے سے نعیم کا مکالمہ یہ ظاہر کر رہا ہے کہ اس بوڑھے آدمی کی شناخت کا بنیادی حوالہ مذہب نہیں تھا اور ایسی ہی صورت حال برصغیر میں بسنے والے باقی لوگوں کی ہو گی کیونکہ ناول میں موجود کردار ہمیشہ نمائندگی کرتے ہیں اس سماج کی جس کے وہ رکن ہوتے ہیں۔

''تم ہندو ہو یا مسلمان؟''نعیم نے جلدی سے سوال کیا۔

''آہا۔ یہ اچھا سوال ہے''۔ وہ انگلی اٹھا کر ہنسا۔ ''یہ اچھا سوال ہے۔ واقعی۔ لیکن مجھے پتا نہیں۔ یہ کچھ ایسا ہے کہ میں مصروف ہی رہا۔ میرا باپ بھی مصروف آدمی تھا۔ مچھیرے کا کام دراصل جان توڑ کام ہوتا ہے ادھر ادھر کی باتوں پر تو دھیان ہی نہیں دے سکتے''(6)

''نادار لوگ (1996ء)''اداس نسلیں کا تسلسل معلوم ہوتا ہے۔ پاکستانی معاشرے کا استحصالی چہرہ سامنے لاتا ہے اور اس استحصالی سامراجی نظام میں اپنی بقا کی جنگ لڑتے ہوئے لوگوں کی کہانی ہے جو ہر سیاست دان کی باتوں میں آکر بہل جاتے ہیں۔ یہ معصوم اور بھولے بھالے لوگ ایک طرف قناعت پسندی کی ترغیب دیتے ہوئے مذہبی

راہنما کے زیر اثر اپنی زندگیوں میں جمود کو توڑنے پر مائل نہیں ہوتے تو دوسری طرف سیاستدانوں اور مقتدر طبقے کی جانب سے رائج کیئے جانے والے بیانیے کے اثر میں صورت حال کو جوں کا توں قبول کر لیتے ہیں۔ عبداللہ حسین نے اس ناول میں اس صورت حال کے قائم رہنے کی وجوہات جس انداز میں بیان کی ہیں اسے آپ بلاشبہ متبادل بیانیہ کہہ سکتے ہیں۔بنیادی طور پر اس ناول میں مذہب اور سیاست کے رائج بیانیوں کے متوازی خیالات کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ عبداللہ حسین تشکیلی حقیقت اور اصل کے بارے میں اپنا نکتہ نظر ناول کے ہیرو سرفراز کے بچپن کے ایک کھیل کی صورت میں اس طرح سے بیان کر رہے ہیں۔

> ''اس خیال کو سمیٹنے کے لیئے اس نے اپنے آپ کو ایک کھیل میں مشغول کر لیا جو وہ اکثر کڑے وقتوں میں کھیلا کرتا تھا۔اس کھیل کا اصول یہ تھا کہ خیال کے اندر حاضر حقیقت کی بجائے ایک الگ اور برعکس حقیقت کی تشکیل کی جائے۔اس تصور کو کسی معمول کی اصطلاح جیسے ''خوش آئند خیالات'' سے بیان کرنا درست نہیں تھا۔کیونکہ یہ ایک ایسی حقیقت تھی جو سرفراز کے اندر حقیقت حال کی نسبت زیادہ حقیقی طور پر وجود میں آتی تھی۔''(7)

یہ جو خیال کے اندر حاضر حقیقت کی بجائے ایک الگ اور برعکس حقیقت کی تشکیل ہے یہ بھی ایک سطح پر متبادل بیانیہ ہے اور عبداللہ حسین کے اسلوب میں یہ بات بار بار ظاہر ہو رہی ہے۔ وہ کسی خیال یا تصور کے بارے میں بیان کرتے ہوئے اس خیال یا تصور کی متبادل صورت بھی آپ کے ذہن میں منتقل کیئے جاتے ہیں۔ہمارے ہاں مذہبی طبقے کا خود راستی کا تصور اور اس سے جڑے جملہ تصورات ہمارے اداروں میں بھی سرایت کر چکے ہیں۔ سماج میں بھی یہ تصورات کہیں صوفیانہ روایت کے ساتھ جڑے اور کہیں مفاد عاجلہ کے لیئے ایک تکنیک کے طور پر استعمال ہوتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ہمارے ہاں ہر چھوٹے سے چھوٹے گاؤں کے باہر قبرستان میں کسی نہ کسی پیر فقیر کا مزار نظر آنا عام سی بات ہے اس پیر کی کرامات کے چرچے کے ساتھ ساتھ اس سے جڑی ایسی کہانیاں بھی سننے کو ملیں گی جیسا کہ عبداللہ حسین لکھتے ہیں۔

> ''وہ کوئی مزار ہے؟'' سائیں نے کہا۔''مشٹنڈوں کا ڈیرہ ہے۔میرا دل کہتا ہے اس مزار میں کوئی کھچر دبایا ہوا ہے۔ادھر کوئی فقیر بھی جاتا ہے تو اس کے کپڑے اتار لیتے ہیں۔''(8)

عبداللہ حسین کے اسلوب کی یہ خاصیت ہے کہ جس چیز پر انہوں نے سوال اٹھانا ہوتا ہے اسے اس انداز سے پیش کرتے ہیں کہ اس کا متبادل اسی وقت قاری کے ذہن میں اپنی تصویر بنا لیتا ہے۔ شہر جا کر پڑھنے والے لڑکوں کے

درمیان گفتگو کے دوران ایک سپاہی کا قصہ بیان کرتے ہوئے انہوں نے رائج بیانیے کی اس جہت کی طرف اشارہ کیا ہے جسے آج بھی ایک طبقہ اپنے وجود کو برقرار رکھنے کی ناکام کوشش میں پیش کیئے جاتا ہے۔ جنگ میں شمولیت کے لیئے اپنی طاقت کس چیز کو بنایا جارہا ہے ایک بیانیے کو اور حقیقت جب سامنے آتی ہے تو سپاہی کے ان جملوں سے واضح ہو رہی ہے جب ایک طالب علم دوسرے سے گفتگو کے دوران ایک سپاہی کی آپ بیتی پر مبنی چند جملے کہتا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں۔

> ''کہتا تھا ہمیں یقین سے بتایا گیا تھا کہ بموں سے ڈرنے کی ضرورت نہیں، دشمن کے بم کوئی ضرر نہ پہنچا سکیں گے۔ آسمان سے سبز کپڑوں میں ملبوس فرشتے آئیں گے اور ہندوؤں کے بموں کو ہوا میں ہی پکڑ کر دریا میں گرادیں گے۔ کہتا ہے وہاں کوئی فرشتہ تھا نہ فرشتے کی ہوا۔ بموں اور توپوں کے دھماکوں سے ان کا پیشاب خشک ہو گیا تھا۔''(9)

پاکستانی معاشرے کی سماجی اور اخلاقی سطح پاکستان بننے کے بعد کیا رہی اور بیس پچیس برس گذرنے کے بعد بھی اس میں کتنی تبدیلی آئی یہ اعجاز کی اس گفتگو سے ظاہر ہوتا ہے جب وہ گھی کے کارخانے کے مالک سے اس کے کارخانے میں بننے والے گھی کے غیر معیاری ہونے کے حوالے سے استفسار کر رہا ہے۔

> ''مگر حاجی صاحب'' اعجاز نے کہا۔ ''ہمارا فرض تو ان چیزوں کو روکنا ہے''
> ''ارے اِس ملک میں سب کچھ چلتا ہے بھئی۔ آپ ہماری مینجمنٹ کے ساتھ معاملہ طے کر لیں۔ میری پُوچھتے ہیں تو آپ کو سچی بات بتاؤں؟'' ''جی'' اعجاز نے کہا۔
> ''جب سے میں نے ہوش سنبھالی ہے میرے دِل میں صرف ایک ہی خواہش ہے' کہ خداوند تعالیٰ مجھے مدینے میں موت نصیب کرے۔'' اعجاز اچنبھے کی حالت میں بیٹھا دیر تک حاجی کریم بخش کا مُنہ دیکھتا رہا۔''(10)

اس ناول میں ملک کی حفاظت پر مامور ادارے اور ان کا معاشرے میں اثر رسوخ اس انداز سے پیش کیا گیا ہے کہ یہ ادارے باقی تمام اداروں میں ہر طرح کی مداخلت کرنے میں آزاد نظر آتے ہیں۔ جبکہ سقوط ڈھاکہ کے حوالے سے ان کی کارکردگی پر کئی سوال اٹھتے ہیں۔ مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے بعد وہاں جنگی قیدی بن جانے والے پاکستانی فوجیوں کے حالات بیان کرتے ہوئے عبداللہ حسین نے بارہا اس بات کی طرف توجہ دلائی ہے کہ مصیبت میں انسان زیادہ مذہبی ہو جاتا ہے۔ مندرجہ ذیل اقتباس اداروں پر اثر رسوخ کے بارے میں ہے۔ جب چاچا عباس سرفراز سے عباس کی نوکری کے بارے میں سفارش کا کہتا ہے تو اس کا انداز اور اس میں موجود یقینی کیفیت ملاحظہ کریں۔

''واہ بھئی واہ، فوج کا راج ہے، تیری بات کون موڑے گا۔ کپتان شپتان پلس میں بھی لگے ہوئے ہیں۔ کسی سے کہہ کر لگوادے۔''(11)

ایوب خان کے زمانے میں جو تبدیلیاں سماجی، سیاسی، معاشرتی اور معاشی سطح پر ہو رہی تھیں ان میں صنعتی دور کی ترقی کے نتیجے میں سرمایہ دارانہ نظام اپنی گرفت مضبوط کرنے میں مصروف تھا اور کمیونسٹ خیالات و نظریات کے بارے میں ایک خاص طرز کا رویہ اپنایا جا رہا تھا۔ کمیونسٹ خیالات رکھنے والوں کو لامذہب کہا جا رہا تھا۔ عبداللہ حسین اعجاز کی زبان سے اس حوالے سے متوازی خیالات پیش کر رہے ہیں جب وہ سرفراز کے کمیونسٹوں کے بارے میں استفسار کا جواب دے رہا ہے۔ ذیل کے اقتباسات دیکھیئے۔

''لالہ، کمیونسٹ کیا ہوتے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''روس اور چین میں رہنے والوں کو کہتے ہیں،'' لالے نے مختصر جواب دیا۔ میری تسلی نہ ہوئی۔ روس اور چین میں رہنے والوں کو تو روسی اور چینی کہتے ہیں، میں نے سوچا۔ ''لالہ،'' میں نے پوچھا۔ ''مولانا بھاشانی کمیونسٹ ہیں؟''

''نہیں نہیں،'' لالہ سختی سے بولا، ''خدمت خلق کرنے والے خدا خوف آدمی ہیں۔ بہت بڑے لیڈر ہیں۔''

میرا ذہن گڈ مڈ ہو گیا۔ آج تک مجھے کمیونسٹوں کے بارے میں پورا علم نہیں حاصل ہو سکا۔ صرف اتنا مزید پتہ چلا ہے کہ کمیونسٹ لامذہب ہوتے ہیں۔ کئی بار ارادہ کیا ہے کہ کسی علم والے سے دریافت کروں، مگر موقع ہی نہیں ملا۔''(12)

مولانا بھاشانی جو مشرقی پاکستان سے تعلق رکھتے تھے اور ان کے بارے میں یہ خیال پایا جاتا تھا کہ وہ کمیونسٹ نظریات رکھتے ہیں۔ ان کے بارے میں عوامی تاثر تو رائج بیانیے کے عین مطابق تھا مگر عبداللہ حسین اسے کسی اور طرح سے دیکھتے ہیں۔

بیانیے کی طاقت اور اثرات کے ضمن میں عبداللہ حسین نے نہایت اہم حقیقت آشکار کرتے ہوئے یہ بتایا ہے کہ جب قیادت کوئی بات عوام سے کہتی ہے تو بسا اوقات عوام براہ راست اسے سمجھ نہیں رہے ہوتے بلکہ ایک کیفیت میں آ کر اس کے بیانیے کا ساتھ دینے لگتے ہیں اور بعض اوقات راہنما خود بھی اسی غلط فہمی میں مبتلا ہو کر عوام کی آواز میں اپنی آواز ملا دیتا ہے۔ پاکستان کی سیاست کی جو صورت حال عبداللہ حسین نے ''نادار لوگ'' میں بیان کی ہے

Journal of Research (Urdu)
ISSN (P): 1726-9067, ISSN (E):1816-3424
Volume No. 42, Issue No. 1, June 2026

آج کی صورت حال اس سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے۔ آج بھی ریاستی اور حکومتی سطح پر بیانیے فکری مغالطے کی صورت ہیں اور عوام ان کو اسی طرح قبول کر کے راہنماؤں کا ساتھ دینے لگتے ہیں۔ سیاست دانوں کے الفاظ چبائے ہوئے اور بے معنی اپنی حقیقت اور معنویت کھو چکے ہیں۔ ایسے میں اگر کسی لیڈر کی کوئی بات عوام غلط فہمی کی بنیاد پر قبول کر کے اس کا ساتھ دینے پر آمادہ ہو جاتے ہیں تو وہ لیڈر خود بھی اسی غلط فہمی کا شکار ہو کر یا عوام کی سادہ لوحی سے فائدہ اٹھا کر عوام کی باتوں کی تائید کرنے لگتا ہے۔ اس بات کی مزید وضاحت کے لیئے مندرجہ ذیل اقتباس ملاحظہ کیجئے۔

> '' یکدم لیڈر نے دونوں ہاتھوں سے تالی بجائی اور لے میں کہنا شروع کردیا انت۔۔۔ قال۔۔۔۔اق۔۔۔تدار ساتھ ہی ساتھ وہ اپنے پاؤں پر چاروں طرف گھوم گیا، جیسے کوئی مست قلندر ہو۔ دیکھتے ہی دیکھتے عوام نے الفاظ اس کے منہ سے اچک لیئے۔۔۔ کسی کو یہ علم نہیں تھا کہ لیڈر نے یہ الفاظ کس ضمن میں بولے تھے، کہ وہ ایک دوسرے شخص کے الفاظ کو دہرا کر اس کا مذاق اڑا رہا تھا۔ مگر ہجوم اپنے تئیں ایک مطالبے کی صورت یہ الفاظ پکار رہا تھا۔ کچھ دیر بعد جب لیڈر نے محسوس کیا کہ لوگ منتقلی اقتدار کا مطالبہ کر رہے تھے تو وہ بھی پلٹ کر ہجوم کے ساتھ شامل ہو گیا، گو اس کا پلٹنا کسی نے نہ دیکھا اور نہ محسوس کیا، کہ الفاظ بھی وہی تھے، حرکات بھی وہی اور سر اور لے بھی وہی تھی۔ اعجاز گو اس سارے عمل میں شامل تھا، مگر ایک خیال کو وہ اپنے دل میں آنے سے نہ روک سکا، کہ کیا سیاست انہی غلط فہم خطوط پر استوار ہوتی ہے؟''(13)

یہ ناول اس خطے میں بسنے والے لوگوں کی صورت حال واضح کرتا ہے جو بظاہر اپنی کم نصیبی کی وجہ سے مفلوک الحال تھے اور اپنی قیادت اور اس کے پروردہ کرداروں کے زیر تسلط ان کے عزائم کی تکمیل میں دن رات الجھے ہوئے تھے یہ طبقہ اشرافیہ ان کو سبز باغ دکھاتا اور حقیقت کو اپنے تشکیل کردہ بیانیے میں چھپا تا رہتا اور جب ان معصوم لوگوں پر یہ عیاں ہوتا کہ ان سے بیان کی گئی باتیں حقیقت نہیں تھیں تو ان کا اعتبار اپنے آپ سے بھی اٹھنا شروع ہو جاتا۔ مشرقی پاکستان کی علیحدگی اور وہاں ہماری شکست حوالے سے حکومتی سطح پر قوم سے جو کچھ بیان کیا جارہا تھا اس میں کتنا سچ تھا اور جب اس حقیقت پر سے پردہ اٹھا تو قوم کی ذہنی و نفسیاتی حالت کیا تھی یہ ہمیں درج ذیل اقتباس سے اندازہ ہوتا ہے۔

> ''اندر اندھیرے کی فضا تھی۔ آٹھ دس ماہ تک مستقل روشنی میں رہنے کے بعد اندھیرے کا پردہ یکدم جو گرا تو لوگوں کو معلوم ہوا کہ وہ روشنی جو اُنہیں دیکھائی جارہی تھی، دِن کی روشنی نہ تھی

Published by:
Department of Urdu
Bahauddin Zakariya University, Multan (Pakistan)-60800
Website: https://jorurdu.bzu.edu.pk/website/

بلکہ رات کی روشنی تھی جو ہاتھ سے جلائی گئی بتیوں سے پیدا کی گئی تھی، جِس کے اندر اُنہیں فر یب نظر کے کرشمے دِکھائے جاتے رہے تھے۔ جَب ہوا تیز چلی اَور بتیاں بجھ گئیں تو تاریکی ہی تاریکی تھی جِس میں ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا تھا اَور دم بخود بیٹھے تھے۔ اس قوم کو کئی بار لڑائی کے میدان میں ہار ہُوئی تھی۔ سینکڑوں برس کے زمانے میں جنگوں سے سابقہ پڑا تھا، کبھی جیت ہُو ئی تھی کبھی ہار۔ مگر کبھی شکست کا احساس نہ ہوا تھا۔ کبھی ہمت نہ ٹُوٹی تھی۔ اب اِس فریب کاری نے جو اَپنے ہی لوگوں نے اَپنی قوم پر روا رکھی تھی، اِس حربی ہار کو شکست میں تبدیل کر دیا تھا۔ قوم کی ریڑھ کی ہڈی میں جو لوہے کی سلاخ تھی، وہ دہری ہو چکی تھی۔ کوئی کھلے بندوں اِس کا ذکر نہ کرتا تھا، مگر لوگوں کا اعتبار پہلے دوسروں پر، پھر اَپنے آپ پر سے اُٹھنا شروع ہو گیا تھا"(14)

حکومتی سطح پر قیادت اور حفاظت کے ذمہ داران کے ہاں اس واقعہ سے متعلق جس طرح کی باتیں زیر بحث تھیں ان کا ذکر جس انداز سے عبداللہ حسین نے کیا ہے وہ ہماری آنکھیں کھول دینے کے لیئے کافی ہے۔ کیپٹن سلطان اور عامر کے درمیان ہونے والی باتیں جنگ میں ہار جیت کے بارے میں سرکاری بیانات سے مختلف نکتہ نظر پیش کرتی ہیں سلطان عامر سے پوچھتا ہے کہ کیا ہم نے کوئی جنگ جیتی بھی ہے تو اس کے جواب میں جب عامر کہتا ہے کہ ہاں سکستی فائیو میں تو سلطان غصے سے کہتا ہے کہ یہ تو نمبر گیم تھی اگر چائنا اپنی بکریاں واپس لینے کی دھمکی نہ دیتا تو اٹھتالیس گھنٹے میں ہماری دفاع کی طاقت ختم ہو جاتی ہمارے پاس ٹروپس کو ریپلیس کرنے کی گنجائش ہی نہیں تھی۔ سلطان مزید خدشے کا اظہار کرتا ہے کہ یہ تاریخ اول تو لکھی نہیں جائے گی اور اگر کبھی لکھی گئی تو بدل دی جائے گی یا حذف کر دی جائے گی۔ بنگالی عورتوں کی عصمت دری کرنے کے بارے میں آج تک متضاد آرا ہمارے سامنے آتی رہی ہیں لیکن عبداللہ حسین اس ناول کے کردار کیپٹن سلطان کے منہ سے جو باتیں ہمارے سامنے پیش کر رہے ہیں یہ کچھ اور ہی کہانی بتا رہی ہیں۔ ذیل کا اقتباس دیکھیے۔

"ہمارے چیف نے ایک جوان کو تھپڑ مارا تھا۔ آپ نے سُنا ہو گا۔"
ہم چپ بیٹھے رہے، گو ہم نے یہ واقع سن رکھا تھا۔ مگر تفصیل ہمیں معلوم نہیں تھی۔
"اُس نے جوان سے ایک سوال پُوچھا تھا، سلطان نے بات جاری رکھی" "جوان نے اِس کا نفی میں جواب دیا تو ٹائیگر صاحب نے ایک زوردار تھپڑ اُس کے مُنہ پر رسید کرتے ہوئے کہا" "جا اوئے خُسرے۔" وہ سوال یہ تھا" "جوان، تم نے کتنی۔۔۔۔"(15)

اسی طرح سرفراز جب جنگی قید سے واپس آتا ہے تو نسیمہ کے ساتھ اس کا مکالمہ بھی جو بتا رہا ہے وہ سرکاری بیانیے کے برعکس ہے۔ نسیمہ سرفراز سے لاتعداد سوال پوچھتی ہے کہ جنگی قید کے دنوں میں وہ ہمیشہ یہ لکھ کر کیوں بھیجتا رہا کہ میں بالکل ٹھیک ہوں اگر یہ حقیقت نہیں تھی تو پھر اس نے حقیقت کیوں بیان نہیں کی۔ عبداللہ حسین نے سرفراز سے اس کے جواب میں ایک ایسے واقعے کا ذکر کرنے کی بجائے اس کے خیال کو کہانی کا حصہ بنایا ہے۔

''کیا میں اِسے بتاؤں کہ جب حقیقت بے اصل ہو گئی تھی اُس وقت میں وہاں پہ موجود تھا؟ جب ایک یونیورسٹی ہوسٹل میں داخل ہو کر اٹھارہ استادوں اَور طالبعلموں کا صفایا کر دیا گیا تو میں وہاں پہ موجُود تھا؟ (16)

''قید (1998ء)'' میں بھی عبداللہ حسین نے ملکی حالات کے تناظر میں ہمیں متوازی حقیقت کے بارے میں آگہی دی ہے۔ عبداللہ حسین بتاتے ہیں کہ پاکستان کے قیام کے وقت سیاستدانوں نے اسلام کے نام پر قوم کو یکجا رکھنے کی کوشش کی اور پھر جب چند برس بعد ہی جرنیلوں کی حکومت قائم ہو گئی تو انھوں نے بھی یہ بنا بنایا حربہ مستعار لے لیا۔ مسلح افواج میں انگریزی کلچر غائب ہو گیا اور انہیں افسروں نے نمازیں پڑھنی اور حج وعمرہ کرنے کے فریضے ادا کرنے شروع کر دیے، جیسے کہ چند ہی روز میں انھوں نے اللہ کے دین کو دریافت کر لیا ہو۔ صدر مملکت پیر پرست جرنیل تھے ان کی دیکھا دیکھی فوج کے سینئر افسران نے بھی مرشد پکڑنا شروع کر دیے۔ اس زمانے میں کرامت علی شاہ کی مرشدی خوب چمکی۔'' (17)

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ قاری کے ذہن میں یہ ساری کہانی پڑھ کر جو فضا ترتیب پاتی ہے اس میں قاری بغیر کسی کوشش کے اس بات کی تفہیم حاصل کر لیتا ہے کہ عبداللہ حسین کا ان واقعات کو اس طریقے سے بیان کرنے مقصد ایک بیانیے پر تنقید اور اس کے متبادل کی طرف توجہ مبذول کرنے کی کوشش ہے۔

حوالہ جات وحواشی

1۔ خالد اشرف، ڈاکٹر، معاصر پاکستانی ناول ایک اجمالی جائزہ، مشمولہ، ہم عصر اردو ناول، ایک مطالعہ، مرتبہ قمر رئیس، علی احمد فاطمی (لاہور: ایم آر پبلیکیشنز، 2007)، ص 122، 121

2۔ محمد عارف، پروفیسر ڈاکٹر، اردو ناول اور آزادی کے تصورات (لاہور: پاکستان رایٹرز کوآپریٹو سوسائٹی، 2006)، 272، 271

3۔ اداس نسلیں کچھ نئے خیالات، عقیل احمد صدیقی، مشمولہ انگارے، عبداللہ حسین نمبر، مرتبین سید عامر سہیل، 2015، ص 196

4۔ عبداللہ حسین، اداس نسلیں (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، 1963)، ص 12

5۔ ایضاً

6۔ ایضاً

7۔ عبداللہ حسین، نادار لوگ (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، 1996)، ص 324

8۔ ایضاً، ص 191

9۔ ایضاً، ص 231

10۔ ایضاً، ص 552

11۔ ایضاً، ص 322

12۔ ایضاً، ص 244

13۔ ایضاً، ص 428

14۔ ایضاً، ص 453

15۔ ایضاً، ص 517

16۔ ایضاً، ص 576

17۔ ایضاً، ص 57